تین کروڑ

مُسلمانوں کی حِفاظت

یعنی

وہ خطبہ جو سید طفیل احمد صاحب منگلوری نے

آزاد مسلم کانفرنس ضلع اٹاوہ

منعقدہ

۹ و ۱۰ ؍ اگست سنہ ۱۹۴۱ء

کے

افتتاح کے وقت پڑھا

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

احید الدین پرنٹر

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں کارکنان کانفرنس ہذا کا دلی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس اہم جلسہ کے افتتاح کی عزت بخشی۔ اس جلسہ کی اہمیت اس وجہ سے اور زیادہ ہے کہ اُس کی صدارت فاضل اجل اور مقرر بے بدل ماہر علوم مذہبی و سیاسی عالیجناب مولینا مولوی محمد حفظ الرحمان صاحب سیوہاروی فرمائیں گے جن کے سامنے مجھے لب کشائی کرنا مشکل معلوم ہوتا ہی۔ تاہم بمصداق الامر فوق الادب اپنے ناچیز خیالات آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں۔

کانفرنس کا مقصد اس زمانہ میں ہندو مسلم سمجھوتہ کی جسقدر عام خواہش ملک میں ہے غالباً اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہی کہ آئے دن کے بلووں اور مذہبی فسادات سے لوگ تنگ آگئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اُن سے نجات ملے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پچھلی جنگ عظیم کے زمانہ میں ہندو مسلم سمجھوتہ کے بعد ہندوستان کے اختیارات میں توسیع ہوئی تھی اور جدید وزارتیں قائم ہوئی تھیں۔ اسی طرح موجودہ جنگ میں جو پہلے سے زیادہ

بڑی ہے اہل ہند کو خیال ہے کہ اگر مختلف خیال جماعتوں میں خاطر خواہ مصالحت ہو جائے تو بالکل ممکن ہے کہ ہندوستان کو کچھ نہ کچھ مزید اختیارات مل جائیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ مثل سابق کے عارضی مصالحت کی بنا پر جو اختیارات ملیں گے وہ ملک کے لئے کہاں تک مفید ہوں گے۔ پچھلا تجربہ بتا رہا ہے کہ مختلف جماعتوں کی باہمی مصالحت زیادہ عرصہ تک نہیں چلی بلکہ ہندوستانیوں کو زیادہ اختیارات مل جانے سے ہندو مسلمانوں کے درمیان اور زیادہ کشیدگی بڑھی اور حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اب جو مصالحت ہو وہ صحیح بنیاد پر قائم ہو تاکہ اُس کا استحکام اور اُس کی پائداری زیادہ ہو۔

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ مسلم اقلیتوں کے صوبوں میں مسلمانوں کو ہندوؤں سے بہت سی شکایتیں پیدا ہوئیں جس کی وجہ سے ان کے دلوں سے اہل ہند کو مزید اختیارات ملنے کا ولولہ نہ صرف نکل گیا بلکہ اُس سے ایک قسم کا خوف پیدا ہو گیا۔ کیونکہ اُنہیں اندیشہ ہے کہ اہل ہند کو مزید اختیارات ملنے کے معنی یہ ہوں گے کہ برادران وطن کے اختیارات میں اور توسیع ہو جائے۔ اندریں حالت وہ اُن پر اور زیادہ زیادتیاں کریں اور چونکہ صوبہ متحدہ بھی مسلم اقلیت کا صوبہ ہے جہاں ہم رہتے ہیں اس لئے اس نازک اور پیچیدہ مسئلہ پر غور و خوض کرنے اور یہ سوچنے کے لئے یہ کانفرنس

طلب کی گئی ہے کہ بلالحاظ اس امر کے کہ ملک پورا آزاد ہو یا اُسے نوآبادیات کی حکومت ملے یا وہ موجودہ غلامی کی حالت میں رہے ہم لوگوں کو امن عافیت اور سکون کی زندگی کس طرح نصیب ہو۔

ان مسائل کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کے گذشتہ سیاسی حالات پر نظر ڈالی جائے اور چونکہ محدود وقت میں زیادہ تفصیل نہیں کیجا سکتی اس لئے آپ کی اجازت سے میں اس بارہ میں صرف مختصر طور پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

زمانہ سابق میں اختلاف کی نوعیت

یہ امر مسلم ہے کہ زمانہ سابق میں ہندو مسلمانوں کے درمیان تعلقات ناخوشگوار نہ تھے۔ جیسی کہ اب ہے۔ اس کا اندازہ نواب مرزا یار جنگ بہادر کی حسب ذیل تحریر سے ہوتا ہے جو شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ سے متعلق ہے اور کپتان ہملٹن کے اقوال کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔

"اس زمانہ (یعنی سترھویں صدی) میں یورپ میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عقیدوں کے گروہوں کے درمیان اختلاف عقائد کی بنا پر سخت کشت وخون ہوتے تھے۔ حتی کہ سلطنت کے حکم سے مخالف عقیدہ رکھنے والے بچوں کو زندہ جلا دینے کے واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے مختلف عقیدہ رکھنے والوں کو جب کپتان

صاحب موصوف نے پر امن زندگی بسر کرتے دیکھا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کپتان ہملٹن موصوف نے سندھ کے ایک قدیم شہر ٹھٹہ کی نسبت لکھا ہے کہ یہاں ریاست کا مسلّمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں میں مذہبی رواداری پورے طور پر برتی جاتی ہے۔ پارسی بھی ہیں عیسائی بھی ہیں اور سب کو اجازت ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کریں۔ شہر سورت کی نسبت لکھا ہے کہ وہاں سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں کوئی سخت جھگڑے اعتقادات و عبادات کے متعلق نہیں ہوتے۔"

اب سوال یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں ہندوستان میں باہمی مذہبی مخالفت تھی تو کیا کسی اور قسم کی مخالفت بھی نہ تھی؟ اس کا جواب پچھلی تاریخوں میں ملتا ہے جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راج اور سلطنت کے حصول کے لئے مختلف نسلوں کے لوگ آپس میں لڑا کرتے تھے۔ اور ان میں سے جو غالب آجاتا وہ سب مذہب والوں کی یکساں حفاظت کرتا تھا۔ غرضیکہ اس زمانہ میں جو کچھ مخالفت تھی وہ قوم نسل اور خاندان کی بنا پر تھی نہ کہ مذہب کی بنا پر غزنویوں اور غوریوں میں سخت مخالفت تھی۔ پٹھانوں اور مغلوں میں سخت عداوت تھی۔ اور دونوں اپنے حریف کو شکست دینے کے لئے ہندو راجپوتوں مرہٹوں اور سکھوں سے ساز کرتے تھے۔ اسی ساز

کرنے کے لئے مغل بادشاہوں نے ہندو راجاؤں کی لڑکیوں سے اپنے شہزادوں کی شادیاں کیں اور نسلی تعلقات پیدا کئے۔ یہ رانیاں خاص شاہی محلات میں مورتیاں پوجا کرتی تھیں اور ہندوؤں کے بہت سے مراسم قلعہ شاہی میں ادا کئے جاتے تھے حتیٰ کہ رکشا بندھن کا تیوہار خود بادشاہ مناتے تھے اور اپنے ہاتھ پر کنگنا باندھتے تھے۔

عہد برطانیہ میں اختلاف کی نوعیت

البتہ برطانیہ کے عہد حکومت میں ان حالات میں تبدیلی ہوئی جس کی بابت سر جان مینارڈ سابق ممبر اگزکٹو کونسل پنجاب نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "یہ صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں میں عام رقابت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی"۔

میں اس ناگوار اور تکلیف دہ مضمون کی وضاحت کرنا نہیں چاہتا کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان عام رقابت کس طرح بڑھی یا بڑھائی گئی۔ البتہ صرف اس قدر عرض کروں گا کہ جب مسلمانوں میں سیاسی بیداری ہوئی تو سب سے اول انہوں نے یہ دیکھا کہ مذہبی عقیدہ کی بنا پر اُن کی کسقدر معاشی حق تلفیاں ہوئیں اور جنکو خود بعض نیک نفس انگریز حکام نے تسلیم کیا۔ چنانچہ سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب "مسلمانان ہند" میں یہ دکھایا کہ تعلیم اور دولت اور آمدنی کے جائز ذرائع سے مسلمان کس طرح محروم کئے گئے بنگال کے اسکولوں میں ہندو‌ؤں کی زبان جاری کی گئی اور زیادہ تر ہندو

استاد مقرر کئے گئے۔ مسلمان تمام بڑے بڑے عہدوں سے خارج کئے گئے۔
سندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا کہ جو ملازمتیں خالی
ہوئی ہیں اُن پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے۔ مسلمانوں
کے تعلیمی اوقاف جن کا رقبہ چوتھائی بنگال کے بقدر تھا ضبط کئے گئے۔ قاضی
جو وراثت نکاح اور طلاق کے مقدمات فیصل کرتے تھے، ان کا عہدہ توڑ
دیا گیا۔ ان حالات کو دیکھ کر مسٹر اے۔ سی۔ بیلی سکرٹری گورنمنٹ ہند نے
اس امر کو تسلیم فرمایا کہ حکومت کے عہدوں اور منافع کے کام مسلمانوں
کے ہاتھوں سے نکل کر ہندوؤں کے ہاتھوں میں چلے جانے سے اچھے تعلیم یافتہ
مسلمان سمجھتے ہیں کہ ان کے مذہب کی وجہ سے ان کے ساتھ یہ بے اعتنائی
برتی جا رہی ہے۔

پنجاب میں جہاں مسلمان استادوں کی اکثریت تھی وہاں مسٹر ارنلڈ
ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کی پالیسی کے مطابق سنہ ۱۸۶۶ء سے دیسی اسکولوں میں
مسلم استادوں کی تعداد گھٹائی گئی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۸۷۳ء میں وہ ۳۵
فیصدی رہ گئی۔ اور انگریزی اسکولوں میں ۲۳ ہیڈ ماسٹروں میں سے صرف
۳ مسلمان تھے۔

بالآخر سنہ ۱۸۷۰ء سے مسلمانوں کے بارہ میں انگریز حکام کی پالیسی بدلنی شروع
ہوئی اور اس وقت سے حکومت کو اُن کی طرف کچھ توجہ ہوئی۔ مگر گرے ہوئے

لوگوں کو اُبھارنے کے لیے غیر معمولی طریقے اختیار کیئے جاتے۔ تب ہی وہ ابھر سکتے تھے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔

اسی دوران میں ۱۸۸۲ء میں لوکل بورڈ قایم ہوئے جن میں مخلوط انتخاب کے ذریعہ ممبر منتخب کئے جاتے تھے۔ اور وائسرائے کی کونسل کے لیے ممبر نامزد کئے جاتے تھے۔ چونکہ ہر شعبۂ زندگی میں مسلمان مغلوب ہو چکے تھے اس لیے مخلوط انتخاب ہو یا نامزدگی ہر جگہ مسلمانوں کی نمائندگی کم ہوتی تھی۔

جداگانہ انتخاب کا عطا ہونا

۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ ہند نے کونسلوں کی توسیع کے مسئلہ پر غور کرنے کو ایک کمیٹی مقرر کی تھی اُس وقت مسلمانوں نے حکومت کے سامنے تمام اپنی ضروریات پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ مسٹر آرچبولڈ پرنسپل علیگڈھ کالج کی وساطت سے حکومت سے بات چیت ہوئی۔ اور وائسرائے کی خدمت میں بمقام شملہ مسلمانوں کا ایک وفد جانا طے ہوا۔ یہ مشہور وفد تمام ہندوستان کے ۳۵ منتخب مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اس وفد کی طرف سے جس کے سردار ہز ہائینس سر آغا خاں تھے جو ایڈریس تیار کیا گیا اس میں مسٹر آرچبولڈ موصوف کا مشورہ ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ یہ ایڈریس اس زمانہ کے مسلمانوں کی درماندگی کا پورا آئینہ ہے۔ مسلمان ایک ہزار سال قبل جب ہندوستان میں آنے شروع ہوئے تو ان کی تعداد بہت

کم تھی۔ مگر جس طرح ہندوؤں میں برہمن کھتری راجپوت ویش وغیرہ چند
ذاتوں کے اعتبار سے گروہ بندیاں تھیں اسی طرح شیخ، سید، مغل، پٹھان
کی تقسیم ذاتوں کے لحاظ سے تھی۔ اور معاشی مفاد کے اعتبار سے اُن میں
دھڑے بندیاں تھیں۔ مثلاً کائستھ ملازمت پیشہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ
حکومت وقت کے دست نگر اور اس کے ساتھ رہتے تھے۔ تجارت پیشہ
لوگوں کے نزدیک مسلمان بادشاہ اور ہندو راجہ میں کوئی فرق نہ تھا۔
ان کے مدنظر ذاتی مفاد تھا۔ جب معزول بادشاہ بہادر شاہ کو رنگون
لے جانے کا حکم ہوا تو حکام وقت نے بازار والوں کو کھڑا ہونے سے منع کر دیا
تھا لیکن شاہی سواری کے نظر آتے ہی تمام بازار والے ہندو مسلمان بے اختیار
کھڑے ہو جاتے اور زار و قطار روتے تھے۔

مگر اس جدید دور میں عہدوں، نوکریوں اور حکام رسی، تقرب سلطانی
اور دوسرے نفع کے کاموں کے لئے مذہب کی بنا پر ملک والوں کی
تقسیم ہو گئی۔ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مگر
اس عرضداشت سے جو وائسرائے کی خدمت میں پیش ہوئی معلوم
ہوتا ہے کہ مثل دیگر صوبہ جات کے وہاں بھی وہ مظلوم تھے۔ تمام
ہندوستان میں وہ چھ کروڑ بیس لاکھ ہونے پر بھی بحیثیت قوم کے
اپنے کو اقلیت میں سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایڈریس میں دکھایا

تھا کہ وہ ہر جگہ غیر محدود اکثریت کے شکار ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے اکثریت کے صوبۂ بنگال میں تین ہندو جج ہائیکورٹ ہیں۔ اور تمام ہندوستان میں آٹھ ہندو ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ مگر مسلمان جج ایک بھی نہیں ہے۔ پنجاب، سندھ اور مشرقی بنگال میں جہاں ان کی تعداد زیادہ ہے وہاں بھی بعض مقامات میں لوکل بورڈوں میں ان کی نمائندگی کم ہے۔ اس لئے درخواست ہے کہ بورڈوں سے لے کر کونسلوں تک ان کے نمائندوں کی تعداد ان کی قومی اہمیت کے اعتبار سے معین کر دی جائے۔ اور انہیں خود اپنے ممبر منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔

اس ایڈریس کے جواب میں وائسرائے نے تمام مطالبات کو بشمول جداگانہ انتخاب کے تسلیم کیا۔ جو مسلمانوں کی حد درجہ کی خوشی کا موجب ہوا۔ جداگانہ انتخاب مسلمانوں کے لئے انجام کار مفید ثابت ہوا ہو یا مضر مگر انگلستان کے اخباروں نے اس پر بڑی خوشیاں منائیں اور لکھا کہ اب ہندوستان کے مختلف فرقوں میں صلح نہ رہے گی۔ بہر حال ۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں یہ حق مسلمانوں کو دیا گیا۔ اس کی رو سے ایک طرف تو کم تعداد، کم تعلیم یافتہ اور کم روپیہ والے مسلمان رہے ان کے مقابلہ میں کثیر التعداد ہندو اور سکھ، پارسی اور عیسائی نیز تمام متفرق قومیں جو مل کر تعداد میں مسلمانوں سے تین چار گونہ تھیں

لاکر کھڑی کر دی گئیں۔ اس وقت تک "قوم" کا لفظ "ذات" کیلئے استعمال کیا جاتا تھا، مگر اب مذہب کے اعتبار سے قوموں کی تقسیم ہو گئی۔

مذہبی بلووں کا سلسلہ

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ مسلمانوں کی طرف سے سنہ ۱۹۰۶ء میں وائسرائے کو جو ایڈریس دیا گیا اس میں مسلمانوں کو بڑے عہدے اور ممبریوں میں مناسب حصہ ملنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جن پر اس وقت تک در وبست دیگر اقوام قابض تھیں۔ مسلمانوں کو ان کا مناسب حصہ ملنے کے معنے یہ تھے کہ ہندوؤں کے ہاتھوں سے نفع کی کچھ چیزیں نکالی جائیں۔ اپنا حصہ حاصل کرنے اور حاصل شدہ چیزوں کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کے لئے ہندو مسلمانوں میں کشاکش شروع ہوئی اور چونکہ قوموں کی تقسیم مذہب کی بنا پر کی گئی تھی اس لئے ان امور میں فریقین نے مذہب کو آلۂ کار بنانے میں اپنی کامیابی سمجھی۔ زمانہ قدیم میں گاؤکشی پر شاید کبھی بلوے ہوئے ہوں گے۔ اب یہ بلوے عیدالضحیٰ پر ہونے لگے اور رفتہ رفتہ اُن کے وقوع کا کوئی وقت نہ رہا۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب جنھیں کھانے پینے اور چھوت چھات کا پرہیز نہیں ہے اُن کی سرپرستی میں گائے کی حفاظت کے لئے سبھائیں اور گوشالے قائم کئے گئے۔ دوسری طرف مسجدوں کے احترام کے لئے باجہ بجنے کو روکا جانے لگا۔ ان امور کی

وجہ سے بلووں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ بالخصوص اجودھیا میں اور ۱۹۱۴ء
میں مظفر نگر میں زبردست بلوے ہوئے ۔ اسی زمانہ میں انگلستان کے
مشہور جرنلسٹ مسٹر لائنل کرٹس ہندوستان آئے ہوئے تھے انہوں
نے بلووں اور جداگانہ انتخاب کے متعلق حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا۔
"چند سال ہوئے جبکہ طریقہ انتخاب جاری کیا گیا اس وقت اس
رعایت (یعنی جداگانہ نیابت) کا دیا جانا انگریزی گورنمنٹ کی سب سے
بڑی غلطی تھی۔ جو اس سے ہندوستان میں سرزد ہوئی۔ میں یقین کرتا
ہوں کہ اگر انتخاب جداگانہ کا اصول مستقل طور پر قائم ہو گیا تو ہم ہندوستان میں
ذات پات کا ایک نیا طریقہ جاری کرنیکے موجب ہوں گے ۔ اور یہ وہ
طریقہ ہوگا جو ہندوستان کی زندگی کو سال بسال گھن کی طرح کھاتا رہیگا
جب تک یہ طریقہ جاری رہے گا ہندوستان کبھی قومیت کے لحاظ سے
متحد نہ ہو سکے گا۔ اور جتنے عرصہ تک وہ قایم رہے گا اتنی ہی مشکل اُس
کے استیصال کرنے میں پیش آئے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آخر کار اندرونی خانہ
جنگی اس کا خاتمہ کریگی ۔ ہم اس امر کے امین ہیں کہ ہندوستان کو
اس قابل بنائیں کہ وہ متحدہ قومیت کا درجہ حاصل کرنے کے قابل ہو جائے
مگر فرقہ وارانہ نمائندگی کا طریقہ جاری کرنے سے میں سمجھتا ہوں کہ ہم
نے اس امانت میں خیانت کی ہے ۔ یہاں کے لوگوں میں اس طریقہ

انتخاب۔ نے اس قدر خراب اثر پیدا کر دیا ہے کہ فی الحال یکبارگی اس رعایت کا منسوخ کرنا ممکن نہیں معلوم ہوتا درانحالیکہ آج سے چند سال پہلے اس کو نامنظور کر دینا آسان تھا لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر ہم ایسے قواعد بنانے میں جن سے وہ زنجیریں جن میں ہندوستان جکڑا ہوا ہے ڈھیلی ہوتی ہوں ناکام رہیں تو ہندوستان کے خلاف ہم ایک ناقابل معافی جرم کے مرتکب ہوں گے"

(خطوط بنام باشندگان ہند صفحہ ۱۱۲ و ۱۱۳ مطبوعہ ۱۹۱۶ء)

بلووں کے علاوہ ہر شعبہ حیات میں مسلمانوں کی زندگی تلخ ہو گئی. جو ملازم ہیں اُن کے مصائب بیان کرنے کی گنجائش نہیں جو کاروبار اور ٹھیکیداریاں کرتے ہیں، اُن کی تکلیفیں بھی کسی سے کم نہیں۔ اب رہیں اسمبلیاں اور کونسلیں وہ بھی عوام کے لئے غیر مفید اور بیکار ہو گئیں چنانچہ انگلستان کے مشہور ممبر پارلیمنٹ مسٹر بریلسفورڈ جب ہندوستان آئے تو انہوں نے کونسلوں کی نسبت حسب ذیل ارشاد فرمایا۔

" ان اصلاحات کے دینے میں ابتدائی غلطی یہ کی گئی کہ مذہب کی بنا پر جداگانہ انتخاب دیا گیا جس نے اقتصادی بنا پر مختلف پارٹیاں نہیں بننے دیں۔ مذہبی جھنڈوں کے تحت میں اب یہی ہوتا ہے کہ اعلیٰ اور متوسط طبقوں کے درمیان عہدوں اور نوکریوں کی تقسیم پر لڑائی

رہتی ہے۔"

سنہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات

باہمی عناد اور رلبوؤں کے علاوہ ماہرین سیاست کے نزدیک جداگانہ انتخاب ملک میں حکومت خوداختیاری قائم ہونے کے بھی منافی تھا۔ چنانچہ لارڈ مارلے وزیر ہند جنہوں نے سنہ ۱۹۰۹ء میں توسیع شدہ کونسلوں کا اجراء کیا۔ انہوں نے ایک مراسلہ میں تحریر فرمایا تھا کہ:۔

"اگر یہ خیال ہو کہ ان اصلاحات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ ہندستان میں پارلیمنٹری طریقہ کی حکومت قائم ہو سکتی ہے تو جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے اس سے کوئی واسطہ نہ ہوگا"

اب سوال یہ ہے کہ جداگانہ انتخاب کی موجودگی میں کونسلوں کو اختیارات ملنے کیوں مضر تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں کونسلوں میں عوام کے نمائندے ممبر محض بطور مشیروں کے ہوتے تھے۔ انھیں خود کوئی اختیارات نہ تھے بلکہ ممبران گورنمنٹ لوگوں کی ضروریات ان ممبروں سے معلوم کرکے بطور جج کے خود رائے قائم کرتے اور اس کے مطابق ملکی انتظامات کرتے تھے۔ اُس وقت تک مختلف فرقوں کے ممبروں کی تعداد کا ملکی انتظامات پر کوئی اثر نہ پڑ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی اپنی قوموں کی طرف سے محض بطور وکیلوں کے ہوتے

ہے۔ مگر کونسلوں کو اختیارات مل جانے کی صورت میں بھی وکیل خود
جج بن جاتے ہیں اور جس فریق کے منتخب کردہ ممبر تعداد میں زیادہ
ہوتے ہیں وہی فریق غالب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر لارڈ مارلے
کے اظہار رائے کے سات سال بعد جب کونسلوں کو مزید اختیارات
دیئے جانے کا سوال پیدا ہوا تو مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے اسبارہ
میں فرمایا:۔

"ہم فرقہ وارانہ انتخاب کو حکومت خود اختیاری کے ارتقاء میں
بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں"

مگر بدقسمتی سے ہمارے مسلمان رہنما جداگانہ انتخاب کو اپنے لئے
رحمت سمجھے ہوئے تھے۔ اسی بنا پر مزید اصلاحات کے حصول کے لئے
سنہ ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ میں ہندو مسلم سمجھوتہ ہوا تو اس کی بنا پر سنہ ۱۹۱۹ء
کی اصلاحات کے وقت فرقہ وارانہ انتخاب کے ساتھ ممبران کونسل کو
مزید اختیارات دیدیئے گئے۔ درانحالیکہ یہ مسلم طور پر اقلیتوں کے حق
میں سم قاتل تھا اور خود لارڈ مارلے لکھ چکے تھے کہ جداگانہ انتخاب کی
صورت میں پارلیمنٹری حکومت نہیں دی جا سکتی۔ بہر کیف جداگانہ
انتخاب کی موجودگی میں کونسلوں کو مزید اختیارات دیئے
جانے سے ایک طرف تو اکثریت کے ہاتھوں میں صوبوں کی حکومت

چلی گئی۔ اور دوسری طرف فرقہ وارانہ انتخاب کی وجہ سے اکثریت کے افراد پر مسلمانوں کا قطعاً کوئی اثر نہیں رہا۔ اور انتظامی امور غیر مسلم وزرا کے ہاتھوں میں جانے سے حق تلفیاں ہوئیں اور بلووں میں اضافہ ہوا۔ مثلاً یہ کہ صرف صوبہ متحدہ میں ۱۹۲۲ء سے کر ۱۹۲۷ء تک پانچ سال میں ۹۰ نوے بلوے ہوئے اور ان میں ہزاروں آدمی زخمی اور مقتول ہوئے اور اس سے زیادہ تعداد میں بیرونی مقامات میں برباد ہوئے اور جیلوں میں گئے۔

۱۹۱۶ء کے میثاق ملی میں ایک اضافہ یہ ہوا کہ مختلف اقوام کے نمایندوں کی تعداد میں نمایاں کمی بیشی کی گئی۔ اس وقت تک کونسلوں میں ہر قوم کے نمایندوں یا ممبروں کی تعداد اُن کی آبادی کی نسبت سے ہوتی تھی۔ مگر اس میثاق کے وقت مسلمانوں نے یہ اصرار کیا کہ ہر صوبہ کی کونسل میں مسلم ممبروں کی تعداد اتنی مقرر کی جائے کہ اگر کسی مسئلہ میں وہ ہندو ممبروں کے ساتھ ووٹ دیں تو حکومت کو شکست دے سکیں اور اگر سرکاری ممبروں کے ساتھ مل جائیں تو ہندو ممبروں کو شکست دے دیں۔ اس اصول کے مطابق پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں نے بڑے ایثار سے کام لے کر اپنے ممبروں کی تعداد گھٹایا جانا منظور کیا تاکہ ان کے بدلے میں اقلیت کے صوبوں میں مسلم ممبروں کی تعداد اتنی بڑھ جائے کہ وہ ایک فریق سے مل کر دوسرے

فریق کو شکست دے سکیں۔ اس کی تفصیل ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگی۔

نام صوبہ	مسلمانوں کی فیصدی آبادی	کونسل میں مسلمان ممبروں کی فیصدی تعداد	مسلمان ممبروں کی فیصدی کمی یا بیشی
پنجاب	٥٥	٥٠	- ٥
بنگال	٥٣	٤٠	- ١٣
بمبئی	٢٠	٣٣	+ ١٣
صوبہ متحدہ	١٤	٣٠	+ ١٦
مدراس	٧	١٥	+ ٨
صوبہ متحدہ	٤	١٥	+ ١١

مندرجہ بالا نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقلیت کے صوبوں میں مسلم ممبروں کی تعداد میں اضافہ کرانے کی خاطر پنجاب نے اپنے ٥ ممبر کم کر کے اپنی نمائندگی پچپن فیصدی سے گھٹا کر پچاس فیصدی منظور کر لی۔ مگر بنگال نے اس سے بھی زیادہ قربانی کی اور اپنے ١٣ ممبر گھٹا کر اپنی نمائندگی ٥٣ فیصدی کی جگہ صرف چالیس فیصدی مان لی۔ اس وقت تمام ہندوستان کے مسلمان اس حکمت عملی سے بالکل مطمئن تھے۔ اگرچہ اس سے انھوں نے دو بڑے صوبوں میں ٣ ½ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت سے دست بردار ہو کر باقیماندہ صوبوں کے ٣ ½ کروڑ مسلمانوں کو صرف اتنا فائدہ پہونچایا کہ وہ غیر موثر اقلیت کی جگہ موثر

اقلیت میں آکر تمام صوبوں میں بطور پاسنگ کے ہو گئے۔[لہ]

بادی النظر میں اس طریقے سے مسلمان ممبروں کی اہمیت اس اعتبار سے بڑھ گئی کہ ضرورت کے وقت اپنی اپنی تجاویز پاس کرانے کے لئے ایک وقت سرکاری ممبر اور دوسرے وقت ہندو ممبر دونوں کے لئے مسلمان ممبروں کی خوشامد کرتے تھے۔ مگر اس سے مسلمانوں کی کوئی معین پالیسی نہ رہی۔ اور کوئی مقصد سامنے نہ ہونے سے وہ مثل تھالی کے بینگن کے ہو گئے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت کونسلوں میں ان کا ساتھ نہ ہندو ممبروں نے دیا۔ اور نہ سرکاری ممبروں نے۔ ہندو ممبر کیوں ساتھ دیتے جبکہ جداگانہ انتخاب کی وجہ سے اُن پر مسلمانوں کا کوئی دباؤ نہ تھا۔ بلکہ اُن ہندوؤں کا دباؤ تھا جن سے انھوں نے یہ کہہ کر ووٹ حاصل کئے تھے کہ وہ صرف ہندوؤں کے حقوق کی حفاظت کریں گے۔ باقی رہے سرکاری ممبر وہ حکومت کی مصلحت کے تابع تھے مثلاً صوبہ متحدہ کی لیجس لیٹو کونسل میں نومبر ۱۹۲۲ء میں جب ڈسٹرکٹ

لہ کل ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد ۶،۶۶،۴۷،۲۹۹

بنگال ،، ،، ۲،۳۹،۸۹،۶۱۹ } ۳،۴۹،۴۵،۳۴۰

پنجاب ،، ،، ۱،۰۹،۵۵،۷۲۱

بورڈ کے قانون کا مسودہ پیش ہوا تو اُس میں ایسی دفعات تھیں جن سے سررشتہ تعلیم کی ملازمتوں میں مسلمانوں کی صریحاً حق تلفی تھی۔ لفٹننٹ شیخ شاہد حسین، مسٹر شاکر علی، مسٹر محمد اسمٰعیل، نواب احمد سعید خاں، نواب محمد یوسف، ممبران کونسل نے ان دفعات میں ترمیمات پیش کیں۔ جن کی مخالفت ہندو ممبران کی طرف سے نہایت دلخراش الفاظ میں ہوئی۔ مسلم ممبران کونسل نے انتہائی کوشش کی کہ حکومت کی طرف سے ان کی تائید ہو۔ بالآخر مجبور ہو کر تمام مسلم ممبر اجلاس چھوڑ کر چلے گئے۔ اور اُن کی غیبت میں وہ مسلم کش دفعات بے رحمی کے ساتھ پاس کر دی گئیں اور حکومت وقت کے کان پر جوں تک نہ رینگی اسی قسم کے بیشمار واقعات دیگر صوبہ جات میں پیش آنے سے مسلمانوں میں سخت بددلی اور مایوسی پیدا ہوئی اور تمام ہندوستان میں کسی صوبہ کی کونسل میں بھی اکثریت نہ رہنے سے انھیں اپنی بے کسی اور بے بسی کا اندازہ ہوا۔ تب سے انھیں خیال ہوا کہ جس طرح ہندوں کو بہت سے صوبوں میں، اسّی فیصدی سے لے کر پچاسی فیصدی تک اکثریت حاصل ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی چند صوبوں میں اچھی اکثریت حاصل ہو جائے اس زمانہ میں اگرچہ ہندو مسلمانوں کے درمیان کافی کشیدگی تھی مگر چونکہ حکومت کی طرف سے ہر دس سال بعد مزید اصلاحات دیئے جانے کے لئے ملکی حالات اور خیالات کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ اس لئے بعض متعصب ہندو بھی مصالحت کیلئے

مسلمانوں کے مطالبات کو لبیک کہنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

چنانچہ ۱۹۲۶ء میں ہندو مہاسبھا کے پریسیڈنٹ مسٹر کیلکر نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مختلف صوبہ جات میں اقلیت والے فرقے بطور یرغمال یا ضمانت کے قرار دیئے جائیں تاکہ انکی ہم مذہب اکثریت جب دوسرے صوبہ میں وہاں کی اقلیت پر ظلم کرے تو اس کے بدلے میں اول الذکر صوبہ کی اقلیت کو دبایا جا سکے،

مسٹر کیلکر کے مندرجہ بالا نظریہ کے تحت میں مسلمانوں نے بھی بعض صوبوں میں اکثریت حاصل کرنے کا منصوبہ قائم کیا اور یہہ تجویز کیا کہ مثلاً پنجاب اور بنگال میں ان کے ممبروں کی تعداد زیادہ ہو جائے۔ تو وہ جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہو جائیں۔ مسلمانان ہند کی سیاسی تاریخ میں یہہ پہلا موقعہ تھا کہ انھیں اپنی اکثریت کی ایک جھلک نظر آئی۔

ہندو مسلم سمجھوتہ

اس کے کچھ عرصہ بعد گوہاٹی کانگریس کے اجلاس کے زمانہ میں جو دسمبر ۱۹۲۶ء میں منعقد ہوا۔ ہندو مسلم سمجھوتہ کی بات چیت ہوئی۔ اور اس کے تین ماہ بعد ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو چند مسلمان لیڈروں کا ایک جلسہ دہلی میں زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح منعقد ہوا اُس میں قرار پایا کہ مسلمان تمام صوبوں میں مخلوط انتخاب ماننے کو تیار رہیں۔ بشرطیکہ انھیں حسب ذیل امور حاصل ہوں۔

(۱) سندھ ایک جداگانہ صوبہ بنا دیا جائے

(۲) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مثل دیگر صوبوں کے اصلاحات جاری کی جائیں۔

(۳) پنجاب اور بنگال میں مختلف قوموں کے ممبروں کی تعداد آبادی کے مطابق ہو۔

(۴) مرکزی اسمبلی میں مسلمان ممبروں کی تعداد ایک ثلث سے کم نہ ہو۔

مندرجہ بالا شرائط میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اٹھارہ برس کے ناگوار اور تکلیف دہ تجربہ کے بعد بھی مسلمان جداگانہ انتخاب کو اپنے لیے رحمت سمجھتے تھے۔ اور اس سے صرف اسی صورت میں دستبردار ہونے کو تیار ہوئے تھے۔ کہ انھیں کچھ دیگر مراعات حاصل ہو جائیں حالانکہ اگر اسوقت بھی کم سے کم مسلم اقلیت کے صوبوں میں جداگانہ انتخاب سے نجات ملجاتی تو ان کے بہت سے مصائب کا خاتمہ ہو جاتا۔ بہرحال طریقہ انتخاب ہی کی بناء پر کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ آل پارٹیز کانفرنس کے جلسہ لکھنؤ منعقدہ اگست ۱۹۲۸ء میں حسب ذیل امور تسلیم کر لیے گئے

(۱) مسلمانوں کو اپنے کلچر اور تہذیب کی ترقی کے لیے موقعہ دیا جائے۔ کہ ان کی اکثریت کے کچھ صوبے ہوں۔ اس لیے سندھ کو بمبئی پریسیڈنسی سے علیحدہ کر کے

ایک نیا صوبہ بنایا جائے

(۲) کانگریس کی مجلس عاملہ نے یہ تسلیم کیا کہ صوبہ سرحدی اور بلوچستان میں وہی آئین نافذ کیا جائے جو دوسرے صوبوں میں ہے۔

مندرجہ بالا تین صوبوں کے علاوہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی آبادی پہلے ہی زیادہ تھی۔ انھیں ملا کر مسلم اکثریت کے پانچ صوبے تسلیم کر لیے گئے مگر اس اثنا میں مسلمانوں کے مطالبات میں اور اضافہ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے یا کانگریس کی بے اعتنائی سے کلکتہ کے اجلاس کانگریس منعقدہ دسمبر ۱۹۲۸ء میں مسلمانوں کے یکجائی مطالبے جن کی نسبت یہ اصرار کیا گیا تھا کہ وہ کلیتہً بلا ترمیم کے منظور کیے جائیں خارج کر دیئے گئے اس کے بعد مسلمانوں کے مطالبات کی تعداد بڑھ کر چودہ سے سترہ تک پہونچ گئی اور جداگانہ انتخاب کی شرط مسلمانوں کے لیے اختیاری رکھی گئی

جدائی کی اسکیم

اس کشاکش میں مسلمانوں کا خیال اپنی اکثریت کے صوبے بنانے کے لیے روز بروز پختہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۳۰ء کے اجلاس مسلم لیگ مقام الہ آباد میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنے خطبہ صدارت میں صاف الفاظ میں فرمایا کہ ہندو اور مسلمانوں کی جدا جدا حکومتیں قائم کر دی جائیں۔ چونکہ یہ مطالبے چند صوبوں میں محض اکثریت مانگنے سے تجاوز کر کے اسلامی حکومت قائم کرنے کے منصوبے تک پہونچ گیا تھا۔ اس لیے

اس نے دیگر اقوام میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ کاش ہماری طرف سے ان خیالات کا اظہار چند صوبوں میں مسلمانوں کی کھلی اکثریت قائم ہو جانے کے بعد کیا جاتا تو زیادہ نقصان دہ نہ ہوتا۔ مگر اس وقت تک تو پنجاب اور بنگال کے ممبروں میں بھی مسلمانوں کو موثر اور کھلی اکثریت حاصل نہ تھی۔ اور وہ سرکاری یا دیگر اقوام کے رحم و کرم پر تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ گول میز کانفرنس میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان صلح کی گفتگو ناکام رہی تھی۔

اس کے دوسرے سال اگست ۱۹۳۱ء میں میں نے ایک رسالہ شائع کیا جس میں صوبہ جات کی تقسیم اس طرح تجویز کی کہ مسلمانوں کی آبادی کا اوسط بعض جگہ ۶۵ فیصدی ۷۰ فیصدی اور ۸۶ فیصدی تک ہو جائے۔ اقلیت کے صوبوں میں پرسنل لا یعنی حقوق نکاح، طلاق اور مذہبی امور کی حفاظت کا انتظام ہو۔ اور ان حفاظت کے قوانین پر عملدر آمد کرانے کے لئے اقلیتوں کو مشترک انتخاب کا حق دیا جائے۔ تاکہ دیگر اقوام کی طرف سے ان کی کم سے کم مخالفت ہو سکے۔ مگر اس سے اگلے سال ۱۹۳۲ء میں جبکہ انگلستان میں گول میز کانفرنس کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا چودھری رحمت علی صاحب نے انگلستان سے "پاکستان" کے نام سے ایک اسکیم کی اشاعت کی۔ مسلمانوں کی مجوزہ حکومت کے صوبہ کا نام "پاکستان" قرار دینے کے یہ معنی ہوتے تھے کہ دیگر اقوام کی اکثریت کے صوبے "ناپاکستان" تھے۔ اس لئے ملک میں اس بارہ میں ایک شور برپا ہو گیا

وزیراعظم کا فرقہ وارانہ فیصلہ

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ گول میز کانفرنس میں حسب منشاء ہندو مسلم سمجھوتہ ناکام ہوا۔ تو یہ مسئلہ وزیراعظم کے سپرد کر دیا گیا۔ چنانچہ موصوف نے کچھ امور تو ہندو مسلمانوں میں گفت وشنید کے دوران میں اور کچھ امور آخر میں مسلمانوں کے بارہ میں طے کر دیئے جو یہ ہیں:۔

صوبہ سرحدی میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک ثلث نشستیں دی جائیں۔ اور افسوس یہ ہو کہ بنگال اور پنجاب میں باوجود مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہونے کے بجائے اکثریت کے وہ اقلیت میں رکھے گئے۔ پنجاب میں اُن کی آبادی ۵۵ فیصدی تھی مگر اسمبلی میں اون کی نیابت ۴۹ فیصدی کی گئی اور بنگال میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ۵۳ فیصدی تھی وہاں صرف ۴۷ ½ فیصدی نیابت دی گئی۔ اور تمام دارومدار ۳۱ عیسائی اور یورپین ممبروں پر رکھا گیا تاکہ جس فریق کو وہ چاہیں کامیاب یا ناکام بنا دیں۔ درآنحالیکہ عیسائیوں کی آبادی اُن کے ممبروں کی تعداد کی نسبت سے صرف ½ تھی۔ مندرجہ بالا دو صوبوں یعنی پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی باقیماندہ تمام برٹش انڈیا کے صوبوں کی مجموعی آبادی سے زیادہ تھی۔ مگر ان کے نمائندے اتنے کم رکھے گئے کہ وہ دوسرے صوبوں کے قلیل التعداد مسلمانوں کی حفاظت کرنا تو درکنار اپنے صوبوں

میں بھی بحیثیت قوم کے برتری حاصل نہ کر سکتے تھے۔

وزیر اعظم کے اس فرقہ وارانہ فیصلہ کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ اس سے ہندوستان کا ہر فرقہ ناراض تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ اسی کی حق تلفی ہوئی ہے۔ اور چونکہ حکومت نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہندوستان کے مختلف فرقے جب کوئی باہمی سمجھوتہ کر لیں گے تو اُسے منظور کر لیا جائے گا۔ اس لئے ہندو مسلمانوں نے الہ آباد میں جمع ہو کر پھر بات چیت کی۔ مگر اس میں کوئی کامیابی نہ ہوئی اس فیصلہ میں ہریجنوں کو فرقہ وارانہ انتخاب دیا گیا تھا۔ مگر گاندھی جی نے فاقہ کشی کر کے اُسے منسوخ کرا دیا انجام کار یہ سرکاری فرقہ وارانہ فیصلہ ۱۹۳۵ء کی اصلاحات میں شامل کر لیا گیا۔ اور نئی اسمبلیاں قائم ہو کر اس پر عملدرآمد شروع ہو گیا۔ اس آئین کی رو سے وزیروں کو اپنے اپنے صوبوں میں کامل اختیارات دیئے گئے۔ اور سرکاری ممبر جو پچھلی کونسلوں میں کبھی ہندوؤں کی طرف اور کبھی مسلمانوں کی طرف ہو کر جسے چاہتے کامیاب بنا دیتے تھے۔ وہ نئی کونسلوں سے خارج کر دیئے گئے۔ اس طرح اس آئین میں مسلم اقلیتوں کو دو طرح کے نقصانات پہونچے۔ ایک یہ کہ صوبہ کے تمام اختیارات کلیتہً ہندو اکثریت کے ہاتھوں میں پہونچ گئے۔ دوسرے یہ کہ اسمبلیوں اور کونسلوں میں سرکاری ممبر جو مسلمانوں کو کبھی کبھی اپنے ووٹوں سے مدد دیا کرتے تھے وہ بھی باقی نہ رہے اور چونکہ طریقہ انتخاب بدستور جداگانہ قائم رہا اس لئے وزراء مسلم اقلیت کو

برٹمس کے برابر نہ سمجھتے تھے۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے تعلقات

شروع میں مسلمانوں نے ان نقائص کا کوئی اندازہ نہ کیا اور ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ اور کانگریس نے دوش بدوش کام کر کے ایک دوسرے کی خوب امداد کی ان انتخابات میں کانگریس کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اس کامیابی کے غرہ میں آکر کانگریس نے مسلم لیگ کی اس خواہش کو پورا نہ کیا کہ صوبہ متحدہ کی اسمبلی میں مسلم لیگ کے نمایندوں کو وزیر بنایا جائے۔ اس پر دونوں جماعتوں میں بگاڑ ہو گیا جس کا اثر تمام اُن صوبوں میں پڑا جن میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ شروع ہی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان وزارتوں کے مسئلہ میں بدمزگی ہو گئی اس سے مسلمانوں کو طرح طرح کی شکایات پیدا ہوئیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اصولاً یہ آئین کسی طرح کامیابی کے ساتھ چل ہی نہ سکتا تھا جس کی پیشگوئی چھبیس ۲۶ سال قبل لارڈ مارلے وزیر ہند نے اور اُنیس سال قبل مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے کی تھی۔ چنانچہ تقریباً تمام صوبوں میں مسلمانوں کو کانگریسی وزارتوں سے بیشمار شکایتیں پیدا ہو گئیں ان شکایتوں کا اظہار اول مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ منعقدہ ۱۹۳۷ء میں کیا گیا۔ اس سے تیسرے سال ۱۹۳۹ء میں لاہور کے اجلاس مسلم لیگ میں وہی پاکستانی اسکیم جو معرض التوا میں پڑی ہوئی تھی از سر نو زندہ کی گئی

اس کے متعلق ایک طویل رزولیوشن پاس کیا گیا۔ اور رزولیوشن کی تعمیل کرانے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ جب سے یہ رزولیوشن پاس ہوا ہے۔ تب سے مسلم لیگ کے بیشمار جلسے اس کی تائید میں اور ہندوؤں کی مختلف جماعتوں کے جلسے اس کی مخالفت میں ہو رہے ہیں اور دونوں طرف سے رسالے اور مضامین شایع کیے جا رہے ہیں جن کی وجہ سے ملک میں ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے۔

پاکستانی اسکیم کی تفصیل

مسلم لیگ کی طرف سے کوئی باقاعدہ منظور شدہ اسکیم پاکستان کے متعلق اب تک شایع نہیں ہوئی ہے۔ البتہ مختلف رسائل میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے جداگانہ خطے بنائے جائیں۔ جن میں مسلمانوں کی پوری حکومت ہو۔ یہ خطے ایک جداگانہ مسلم فیڈریشن کے تحت میں ہوں اور اُن کا کوئی تعلق کسی اور وفاقی حکومت سے نہ ہو۔ اور وہ ہر اعتبار سے کامل آزاد ہوں۔ اس اسکیم کی رو سے مختلف اصحاب نے مختلف خطے تجویز کیے ہیں۔ تاہم حسب ذیل خطوں پر زیادہ تر اتفاق ہے۔ [1]

---

[1]:- یہ نوٹ صفحہ ۲۸ کے نیچے ملاحظہ فرمایئے

خطے		مسلم آبادی فیصدی	ہندو آبادی فیصدی
مسلم خطے	پاکستان جس میں پنجاب صوبہ سرحدی سندھ بلوچستان اور ریاستیں شامل ہیں	۶۰	۴۰
	بنگال	۵۷	۴۳
ہندو خطے	ہندوستان جس میں صوبہ متحدہ بہار، اڑیسہ، بمبئی مدراس، سی۔ پی۔ وسط ہند، راجپوتانہ وغیرہ شامل ہیں	۱۰	۹۰
	دہلی	۲۸	۷۲
	مالابار	۲۷	۷۳
حیدر آباد جس کو جداگانہ خطہ قرار دیا ہے		۷	۹۳

مندرجہ بالا نقشہ میں مسلم خطوں میں ہندو اقلیت کی آبادی چالیس فیصدی اور ۴۳ فیصدی دکھائی گئی ہے۔ اور جب کہ ہندو مسلم طور پر زیادہ تعلیم یافتہ اور دولت مند ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان پر صرف ۶۰ فیصدی اور ۵۷ فیصدی مسلم آبادی کا پورا تسلط کس طرح ہو سکے گا اور وہاں خالص اسلامی حکومت کس طرح قائم ہو سکیگی برخلاف اس کے ہندو خطوں میں ۹۰ و ۷۳ اور ۷۲ فیصدی ہندوؤں کے مقابلہ میں صرف ۱۰، ۲۷ اور ۲۸ فیصدی مسلمان ہیں جو علم و دولت کے اعتبار سے نہایت کمزور ہیں۔ مسلم خطوں کی آبادی ۵ کروڑ ۳۸ لاکھ ہے۔ جن کے لئے اسلامی حکومت ملنے کا منصوبہ ہے ہم ان توقعات کا خلوص دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ مسلم اقلیت کے صوبوں کا کیا انجام ہوگا۔ جن میں جدا جدا تو مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ مگر سب کو ملانے سے دو کروڑ اسی لاکھ تک پہونچ جاتی ہے۔ یہ تعداد اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد کے نصف کے قریب ہے۔ اس قدر

نوٹ متعلق صفحہ ۲۶

ل یہ نقشہ پروفیسر ظفر الحسن پروفیسر مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری لکچرار یونیورسٹی مذکور کے مشترک رسالہ سے لیا گیا ہے۔

کثیر التعداد مسلمانوں کی حفاظت کے لئے تجویز کیا گیا ہے کہ اگر ہندو انھیں ستائیں تو انھیں ترک وطن کرکے پاکستان اور بنگال میں جاکر آباد ہونے کا اختیار ہوگا۔ اور خود اقلیت کے صوبوں میں کوشش کی جائے گی کہ دیہات میں چھوٹی آبادیوں میں سے انھیں اٹھاکر ان کی یکجائی بڑی آبادیاں قائم کی جائیں۔ ان کے مذہب کلچر۔ اور تمدن کو قوانین کے ذریعہ سے محفوظ کیا جائیگا۔ اور اگر انھیں ہندو اکثریت تنگ کرے گی تو اس کے بدلے میں پاکستان میں ہندو اقلیت کو دبایا جائے گا۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا پاکستان اور بنگال میں ۴۰ اور ۴۳ فیصدی دولت مند اور تعلیم یافتہ ہندو جو اب بھی وہاں کی یونیورسٹیوں اور بڑے عہدوں اور کارخانوں اور تجارتوں پر قابض ہیں اتنے ہی دبائے جاسکیں گے جتنے کہ ہندوستان میں جو صوبہ متحدہ بہار، اڑیسہ، بمبئی۔ وسط ہند اجنوبانہ وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ۹۰ فیصدی ہندو ۱۰ فیصدی مسلمانوں کو اور صوبہ دہلی وغیرہ میں ۷۲ فیصدی ہندو ۲۸ فیصدی مسلمانوں کو دبا سکیں گے۔ اور چونکہ بدقسمتی سے یہ ضلع اٹاوہ اسی خطہ میں واقع ہے۔ جس میں مسلمان حد درجہ کی اقلیت میں ہیں اسلئے ہمارے دلوں میں اپنی خطرناک حالت کے متعلق وسوسے پیدا ہونا جس کا تجربہ اب بھی بہت کچھ ہو رہا ہے ایک قدرتی امر ہے۔ یہی خطرہ اور وسوسہ

ہماری اس کانفرنس کے انعقاد کا موجب ہوا ہے

دو کروڑ مسلمان کچل دیئے جائیں

ہمارے رہنما ہم سے کہتے ہیں کہ وہ اکثریت والے سات کروڑ مسلمانوں کو آزاد کرانے کے لئے باقی ماندہ دو کروڑ مسلمانوں کی شہادت کی آخری رسم ادا کرنے کے لئے تیار رہیں۔ ۷ کروڑ مسلمانوں کی آزادی کی خاطر دو کروڑ مسلمانوں کو کچل جانے دو"

ہم قائد اعظم کی حکم کی تعمیل میں شہید ہونے کو بخوشی تیار ہیں۔ بشرطیکہ ہم ایک علانیہ جنگ میں دشمن کے مقابلہ میں آکر سب کے سب قتل اور شہید ہو جائیں۔ اور اسطرح ایک ابدی زندگی حاصل کریں مگر ہو تو یہ رہا ہے کہ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کا مذہب زبان، اور کلچر سب مٹائے جارہے ہیں۔ ہر شعبہ زندگی میں ان کے حقوق پامال ہورہے ہیں پبلک اسکولوں میں ان کے ساتھ خراب برتاؤ کیا جاتا ہے۔ لوکل بورڈوں کے قوانین میں اگرچہ مسلم حقوق درج ہیں مگر جداگانہ انتخاب ہونے کی وجہ سے انکے ممبروں کا اتنا دباؤ نہیں ہے کہ وہ ان قوانین پر عملدرآمد کراسکیں۔ دفتروں اور عدالتوں میں نوکریوں اور دوسرے کاموں کیلئے جاتے ہیں تو انھیں دھکے ملتے ہیں۔ اور کوئی صورت امن کی نہیں معلوم ہوتی جب تک کہ غیر مسلموں کی صورت بنا کر انکے طریقے اختیار نہ کریں

اسی ماہ جولائی کا واقعہ ہے کہ ضلع سہارنپور کے دیہات میں چند علماء
بغرض نماز روزے کی تعلیم دینے گئے تھے۔ وہ گاؤں کے غریب مسلمانوں کے
یہاں ٹھہرے تھے۔ ہندو زمیندار نے رات کے وقت مسلمانوں کو مجبور کیا
کہ مولویوں کو اپنے گھر سے نکال دیں۔ جب وہ نکل کر گاؤں سے باہر پہونچے
تو گاؤں کے ہندوؤں نے انھیں مار مار کر زخمی کر ڈالا۔ اسلام ایک تبلیغی مذہب
ہے۔ اس کے پیروؤں کے لئے یہ کہاں تک جائز ہو سکتا ہے کہ چھ سات
کروڑ کے نفع کے لئے سو پچاس نہیں بلکہ پورے دو ڈھائی کروڑ مسلمانوں
کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ یا تو اپنا مذہب اور کلچر بدل دیں ورنہ
وہ اور انکے بیوی بچے سسک سسک کر اور ذلیل و خوار ہو کر وہ
اکثریت کے صوبوں کے نفع کے لئے کچلے اور روندے جائیں اس سے تو
شہادت کا درجہ حاصل نہ ہوگا بلکہ یہ تو کھلی خودکشی ہوگی جو اسلام میں حرام ہے
ان خوفناک حالات میں بھی ہمیں اپنے سیاسی رہنماؤں سے یہ مطالبہ
کرنے کا حق ہے کہ وہ پاکستانی اسکیم کو کامیاب بنانے کی تدابیر اختیار
کرنے کے ساتھ ساتھ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو امن و عافیت
میں رہنے کا کوئی طریقہ تجویز کریں۔

علاج (۱) مخلوط انتخاب:۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ بلووں اور کشت و خون
کی وجہ سے ملک کی فضا مکدر ہونیکے باوجود جہاں بھی مخلوط انتخاب جاری ہوا

وہاں اقلیتوں کی حالت بہتر رہی مثلاً لوکل بورڈوں میں ہندو ممبروں کو ہندو ووٹر اور مسلمان ممبروں کو مسلمان ووٹر منتخب کرتے ہیں۔ مگر بورڈ بنجانے پر ہندو اور مسلمان ممبر دونوں ملکر مخلوط انتخاب کے طریقہ پر ایک چیرمین منتخب کرتے ہیں ان انتخابات میں مسلمان ممبر کس مپرسی کی حالت میں نہیں رہتے بلکہ بعض وقت انکے ووٹ چیرمین کے لئے فیصلہ کن ہوتے ہیں اس لئے بعض مقامات میں منتخب شدہ ہندو چیرمین پر مسلمان ممبروں کا خاصہ اثر رہتا ہے۔ اور بعض جگہ تو ہندو ممبروں کی باہمی کشاکش میں کوئی مسلمان چیرمین منتخب ہو جاتا ہے۔ مخلوط انتخاب کا دوسرا تجربہ صوبہ متحدہ میں ٹاؤن ایریاؤں میں ہوا ہے۔ وہاں معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب جاری ہے اس کا اثر یہ ہے کہ تمام ملک میں ہندو مسلم تنازعات ہونے کے باوجود قصبہ جات میں اکثر جگہ ممبروں میں مذہبی پارٹیوں کی جگہ سیاسی پارٹیاں قائم ہیں۔ اور دونوں پارٹیوں میں کچھ مسلمان اور کچھ ہندو ملے جلے ہوتے ہیں اسلئے بجز مخصوص حالات کے بالعموم مذہبی جھگڑے کم ہوتے ہیں

جداگانہ انتخاب کی صورت میں ایک ہندو امیدوار ممبری عام مسلمانوں کے ووٹوں سے مستغنی ہوتا ہے۔ مگر مخلوط انتخاب میں اُسے مسلمان ووٹروں کے پاس جانا پڑتا ہے اسکی وجہ سے بالعموم وہی ہندو ممبر منتخب ہوتا ہے جو کم متعصب ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مخلوط انتخاب سے جو مسلم ممبر منتخب ہوتے ہیں وہ ہندوؤں کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ ہندو ممبر بھی تو کچھ نہ کچھ مسلمانوں کے زیر اثر ہو جاتے ہیں۔ اور کم سے کم اتنا فائدہ تو ضرور ہے کہ جو ہندو مسلمانوں کے ووٹ سے منتخب ہوتا ہے۔ وہ خود مسجد کے سامنے باجہ بجوانے کے لئے نہیں آسکتا۔ اور مذہبی مسائل میں مبتلا ہونے کی جگہ لوگوں کی آسایش اور نفع کی تجاویز پیش کرنا اپنے لئے مفید سمجھتا ہے۔ باقی رہے مسلمان ممبر۔ چونکہ فیصلہ ووٹوں کی تعداد پر ہوتا ہے اس لئے جداگانہ انتخاب کی صورت میں ان کا عدم وجود برابر ہوتا ہے۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ ہندوؤں کی موجودہ ذہنیت کے ہوتے ہوئے مخلوط انتخاب مسلمانوں کے لئے مضر ہوگا۔ مگر موجودہ ذہنیت بھی تو مخلوط انتخاب نہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے۔ جس طرح مسلمان ہندوؤں کی خراب ذہنیت کے شاکی ہیں کہ وہ مسلمانوں کو تکلیف دیتے ہیں اسی طرح ہندو مسلمانوں کی اس ذہنیت کی شکایت کرتے ہیں کہ جہاں اُنھیں اختیارات حاصل ہیں وہاں وہ ہندوؤں کو تنگ کرتے ہیں اور ملک کی ترقی میں روڑا اٹکاتے رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ صحیح بھی ہے کہ جداگانہ انتخاب ہونے کی صورت میں اکثریت کے لوگوں کو زیادہ اختیارات مل جانے سے مسلمانوں کی حق تلفیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے مسلمان بالعموم ہندوستانیوں

کو مزید اختیارات ملنے سے گھبراتے ہیں۔ کیونکہ وہ اختیارات ہندو اکثریت کے ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے ۱۹۰۶ء سے جو مسلمانوں کے ذہن میں یہ سمجھا گیا ہے کہ جداگانہ انتخاب اُن کے حقوق کی حفاظت کے لئے مفید ہے وہ اُن کے ذہن سے کسی طرح نہیں نکلتا۔ اور جب ہندوؤں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ درپیش ہوتا ہے تو نوبت سے حقوق یہ کہہ کر مانگے جاتے ہیں کہ اگر وہ مل جائیں تو مسلمان جداگانہ انتخاب سے دست بردار ہو جائیں گے درآں حالیکہ جداگانہ انتخاب ہی اُن کے لئے سب سے زیادہ نقصان رساں ثابت ہوا ہے۔ اور اس قابل ہے کہ سب سے اوّل اُس سے نجات حاصل کی جائے۔ جداگانہ انتخاب کی موجودگی میں ہندو مسلمانوں نے مل کر ۱۹۱۹ء کی اصلاحات گورنمنٹ سے حاصل کیں تو مسلمانوں نے نقصان اُٹھایا۔ پھر ۱۹۳۰-۳۲ء کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں بھی جداگانہ انتخاب کی زنجیر مسلمانوں کے گلے میں پڑی رہی۔ ۱۹۳۵ء میں مزید اصلاحات ملنے پر جب اسمبلیوں اور کونسلوں سے سرکاری ممبر خارج کر دیئے گئے جو بعض وقت مسلمان ممبروں کے ساتھ ووٹ دیدیا کرتے تھے تو اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں پر اور زیادہ مظالم ہوئے جو قدرتی تھے۔ وجہ یہ ہے کہ دوسری قوم کا کوئی نیک نفس وزیر اگر مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا تھا تو اُسکے

مسٹر دو ڈروزیر مذکور کی گردن پر سوار ہو کر کہتے تھے کہ آئندہ انتخاب میں دیکھیں گے کہ تم کس طرح ممبر بنتے ہو

صوبہ متحدہ کی کونسل میں جب ٹاؤن ایریا کا قانون ۱۹۲۴ء زیر پیش ہوا تو گورنمنٹ کے نیک نفس سکریٹری سر آئی وو ایلیٹ نے نہایت صداقت سے فرمایا تھا کہ اقلیت کا سب سے کاری ہتھیار مخلوط انتخاب ہے جس کے ذریعہ وہ اکثریت کے دو ٹکڑے کر کے اسے کمزور کر سکتی ہے پس اقلیت کے صوبوں میں دو ڈھائی کروڑ بیکس مسلمان اگر ہندوؤں کی دست برد سے بچائے جا سکتے ہیں۔ تو صرف اس طرح سے کہ وہاں ٹاؤن ایریا سے لے کر اسمبلیوں اور کونسلوں تک میں متعین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب جاری کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ بالخصوص اقلیت کے صوبوں میں مخلوط انتخاب کو نظر انداز کر کے حکومت سے یا ہندوؤں سے کسی سمجھوتہ مثلاً پاکستانی اسکیم کی عملدرآمد پر یا وائسرائے کی اگزیکیوٹو کونسل میں مسلمان ممبروں کے اضافہ پر اکتفا کر لینے سے ڈھائی کروڑ مسلمانوں پر اتنا بڑا ظلم ہوگا کہ اس کی نظیر نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ دنیا بھر کی تاریخ میں نہ مل سکے گی۔

علاج نمبر ۲ پرسنل لا کی حفاظت

اب رہی مسلمانوں کے مذہب اور کلچر کی حفاظت اس کا خاتمہ تو اس وقت ہو چکا تھا۔ جب کہ

سنہ ۱۹۶۰ء میں حکومت وقت نے پرسنل لا کے متعلق قاضیوں کے اختیارات سلب کر لیے اور مسلمانوں کی وراثت نکاح وطلاق کے معاملات بلا امتیاز مسلم اور غیر مسلم کے سرکاری حکام کے ہاتھوں میں دیدیئے۔ ممکن ہو کہ اکثریت کے صوبوں میں اسلامی حکومت قائم ہو جانے پر خود بخود مسلم کلچر، زبان اور مذہب کی حفاظت کے سامان پیدا ہو جائیں۔ مگر مسلم اقلیت کے صوبوں میں ڈہائی کرڑ مسلمانوں کے کلچر زبان اور مذہب کا کیا حشر ہوگا۔ جبکہ اُن کی قسمت در و بست ہندو اکثریت کے ہاتھوں میں پہونچ جائیگی۔

بدقسمتی سے اس وقت تو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت زیادہ تر اس بات میں سمجھی گئی ہے کہ ملازمتوں میں اُن کا مناسب حصہ ملے۔ اسی ٹاوہ میں پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سنہ ۱۹۳۰ء میں نواب صدر یار جنگ بہادر نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہمارے جدید تعلیمیافتہ اصحاب کی حالت یہ ہے کہ ڈپٹی کلکٹری اور اعلیٰ عہدوں میں اپنا حصہ بٹانے وقت تو وہ پورے مسلمان ہونے کے مدعی ہوتے ہیں مگر جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا وقت آتا ہے تو نظر نہیں آتے ایسے اصحاب کو پرسنل لا کا احساس ہونا ذرا مشکل ہے۔ اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ محض مولوی اور قاضی اور مفتی، وراثت نکاح اور طلاق کے مقدمات کس طرح فیصل کر سکینگے مگر جبکہ یہ امور سنہ ۱۹۶۰ء تک اُن اصحاب کے ہاتھوں میں رہے

نہ کوئی وجہ نہیں کہ اگر یہ حق مسلمانوں کو مل جائے تو ان میں ایسے قابل لوگ نہ ملیں گے جو ان فرائض کو خوبی سے انجام دے سکیں۔

پس ضرورت ہے کہ سمجھوتہ کے وقت اس حق کے حصول پر پورا زور دیا جائے تاکہ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کے یہ نازک مذہبی مسائل غیر اقوام کی مداخلت سے محفوظ رہیں۔

آخر میں ہم دعا کرتے ہیں کہ ہمارے رہنما ہندوستان کے چند خطوں میں اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوں۔ مگر اسی کے ساتھ ہماری استدعا ہے کہ وہ ہمارے صوبہ میں معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب جاری کرا کے ہمیں اس قابل بنا دیں کہ ہم بھی مسلمان رہ کر اور زندہ رہ کر امن و عافیت کی زندگی بسر کر سکیں۔ اگر ہم عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم پاکستان کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں اُن کے دوش بدوش کام نہ کریں۔ اور اُن کے لئے قوت بازو ثابت نہ ہوں۔ ہمارا زندہ رہنا ہمارے کچلے جانے اور فنا ہو جانے کے مقابلہ میں اُن کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور مفید ثابت ہوگا۔

ختم کرنے سے قبل میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں کہ میرا عریضہ زیادہ طویل ہو گیا۔ درآنحالیکہ میری پوری کوشش تھی کہ وہ مختصر ہو۔ مگر مضمون اتنا وسیع تھا کہ اُس میں زیادہ کمی نہ کر سکتا تھا۔ میں آپ کا دلی

شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ آپ نے میری طویل داستان سن لی۔ اب آپ ہمارے معزز اور قابل صدر کی رہنمائی میں جو طریقہ مسلمانوں کی بھلائی کا مناسب سمجھیں اختیار کریں۔

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

اب میں اس کانفرنس کا افتتاح کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ جس مقصد سے آپ صاحبان نے اسے منعقد کیا ہے اس میں کامیابی ہو اور آپ کی پاس کردہ تجاویز قوم میں مقبول ہوں۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن

تمام شد

محمد احید الدین پرنٹر و پبلیشر مالک نظامی پریس

بدایوں۔ یو۔پی

۱۹۵۳